

غلام عباس: ایک تاثر

محمد شہباز

لیکچرار اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور

:Abstract

Ghulam Abbas is ranked among the most prominent Urdu short story writers of the twentieth century. Though he started his career with translations, gradually created a peculiar niche for himself among the top rank of other creative writers. In his short stories, he has very successfully presented our day-to-day social issues. The writer, in this article, has made an attempt to project Ghulam Abbas's voyage as a short story writer with a critical and research oriented approach.

کلیدی الفاظ:

غلام عباس، ترجمہ نگار، حقیقت نگاری، سماجی مسائل، نفسیاتی عوامل، طنز، ثنویت کے حامل کردار بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے آٹھویں دہائی تک جن قلم کاروں نے اردو افسانہ کے قارئین کو نئے نئے جزیروں اور گزرگاہوں سے روشناس کرایا، اُن میں غلام عباس (۱۹۰۹ء-۱۹۸۶ء) کا نام کئی حوالوں سے بہت معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ غلام عباس ترجمہ نگار، ناول نگار، کالم نگار (۱)، براڈکاسٹر (۲) اور ایک ایڈیٹر کے رُوپ میں کثیر الجہات حیثیات کے مالک تھے، تاہم اُن کا اصل میدان افسانہ نگاری ہی ٹھہرا، جو پانی میں نمک کے مصداق اُن کے مزاج میں حلول ہو چکا تھا۔ اِس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اُن کا ظاہر

و باطن سرا سراسر افسانے کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ غلام عباس کو اُردو افسانے کی صنف سے کچھ ایسی مناسبت تھی، جیسی مچھلی کو پانی سے ہو کرتی ہے۔ گویا افسانہ اور غلام عباس بہ اعتبار مزاج ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے اور اُن کا افسانوی مزاج اور سنجیدہ فکری فی الحقیقت افسانے کی صنف سے خوب لگا کھاتی تھی۔

اس امر سے بھی غلام عباس کے افسانوی مزاج کی بہ خوبی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اپنی پہلی کہانی ”بکری“ (۳) کے عنوان سے اُس دور میں لکھی، جب وہ ابھی محض ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب انگریزی زبان کی علمی و ادبی تحریروں کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کا چلن عام تھا اور انگریزی سے اُردو ادب میں ترجمہ شدہ تحریروں کی قدر دانی کی بہ دولت ترجمہ نگاری کا فن روز افزوں تھا۔ غلام عباس جب لاہور کے دیال سنگھ ہائی اسکول کے طالب علم تھے تو اپنے ایک اُستاد (۴)، جنھیں ادب کا بڑا لپکا تھا، اُنھیں اپنی پسند کی انگریزی نظمیں اور کہانیاں اُردو میں ترجمہ کر کے دکھایا کرتے تھے اور اُنھی کی حوصلہ افزائی اور داد و ہش نے غلام عباس کو مستقبل کا ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا۔

غلام عباس کا اڈولین افسانہ جو اُن کی ابتدائی پہچان بنا، وہ ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) (۱۸۲۸ء-۱۹۱۰ء) کے افسانے "The Long Exile" کا اُردو ترجمہ تھا، جو پندرہ، سولہ برس کی عمر میں اُردو کے ایک معروف رسالے، "ہزار داستان" میں ایک خصوصی تعریفی نوٹ کے ساتھ ۱۹۲۵ء میں، "جلاوطن" کے نام سے شائع ہوا۔ یوں یہ بات بغیر کسی بحث و تہیص کے پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جدید افسانے کے آغاز سے قبل ہی غلام عباس (بہ صورت تراجم ہی سہی) اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کر چکے تھے۔ اس ابتدائی ترجمہ نگاری کا اُنھیں یہ فائدہ ہوا کہ وہ افسانے کی تکنیک اور دیگر فنی و فکری مبادیات افسانہ کے رموز سے جلد آشنا ہو گئے۔ بوجہ اپنی کم سنی اور کم علمی کے، اُنھوں نے لغت کا دامن پکڑ کر کئی انگریزی ادب پاروں کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کا کٹھن اور اعصاب شکن مرحلہ، علم و ادب سے اپنی طبعی مناسبت کی بہ دولت نہ صرف بہ آسانی طے کر لیا، بل کہ اپنی ادبی پہچان کے ابتدائی خدو خال کے لیے خام مال بھی تیار کر لیا۔ اس حوالے سے شہزاد منظر (۱۹۳۳ء-۱۹۹۷ء) لکھتے ہیں:

”انگریزی ادب سے متعلق ان کا تمام تر علم ان کی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا۔ وہ انگریزی اور اُردو ادب کے بہت سنجیدہ قاری تھے۔ کتابوں کے بہت رسیا تھے۔ اس لیے چھٹی کے دنوں میں عموماً صدر میں فٹ پاتھ پر کتابیں تلاش کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھی۔ غلام عباس نے افسانہ لکھنے کا آغاز ایسے زمانے میں کیا تھا جب اُردو افسانہ

انگریزی، روسی اور فرانسیسی کے جدید ادب اور ادب کی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بہت ترقی کر چکا تھا۔” (۵)

ازاں بعد ”پھول“، ”تہذیب نسواں“ (۶)، ”آواز“ (۷) اور ”آہنگ“ (۸) ایسے مؤثر ادبی جریدوں سے وابستگی نے اُن کے ادبی ذوق کو نہ صرف جلا بخشی، بل کہ اُن کے افسانوی مزاج کو صیقل کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے صدر پاکستان جنرل ایوب خان (۱۹۰۷ء-۱۹۷۴ء) کی آپ بیتی ”Friends not masters“ کا ترجمہ ”جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی“ (۱۹۶۷ء) کے نام سے کیا، جو فن ترجمہ نگاری کے ضمن میں اُن کی فنی عظمت پر دال ہے۔ کتاب کے مندرجات سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ ترجمہ بلا کی خوبیوں سے متصف ہے۔ علاوہ ازیں ”الحمراکے افسانے“ (۱۹۳۰ء) اور ”جزیرہ سخوراں“ (۱۹۴۱ء) بھی اُن کے تراجم کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تاہم ”آنندی“ (۱۹۳۸ء)، ”جاڑے کی چاندنی“ (۱۹۶۰ء) اور ”کن رس“ (۱۹۶۹ء) ایسے طبع زاد افسانوی مجموعے ہی درحقیقت غلام عباس کی اصل پہچان بنے۔ اُن کے طبع زاد افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ دامن گیر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے زندگی کی سچائیوں سے نظریں چرانے یا راہ فرار اختیار کرنے کی روش کو اپنا شعار نہیں بنایا، بل کہ زندگی کی تلخ اور کسلی حقیقتوں کو سلیقہ مندی اور ہمدردی کے ساتھ سپرد قلم کرنا اپنا دھرم سمجھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۲۹ء-۲۰۱۹ء) کی رائے میں:

”سچائی امر ہے اور سچائی کا اظہار خود تحریر کو بھی امر بنا دیتا ہے۔ غلام عباس صاحب نے زندگی کے سمندر سے سچائیوں کے ایسے ہی موتی چُن کر اُنھیں خوب صورت ہار کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ بھی اسی لیے امر ہیں۔“ (۹)

غلام عباس کے ہاں مغربی ادب سے اخذ و قبول کی بہ دولت نہ صرف اُن کی ابتدائی ادبی تربیت کا سامان مہیا ہو گیا، بل کہ ابتدا اُنھوں نے اپنے نامساعد اقتصادی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسے ایک ڈھال کے طور پر بھی استعمال کیا، تاہم اُن کے ہاں مغربی ادب سے اثر پذیری کی تہہ اس قدر ہلکی اور مہین ہے کہ اُس کی شناخت کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ مغربی ادب سے اخذ و قبول کی یہ ہلکی سی لہر اُن کی کہانیوں میں کہیں بنیاد اور کہیں افسانے کی تعمیر میں مسالے کے طور پر کام تو ضرور آتی ہے، تاہم اسے چربہ یا نقلی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ ناقدین نے اُن کے شہرہ آفاق افسانہ ”آنندی“ کو پریم چند (۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء) کے ناول ”بازارِ حسن“ اور ”ناک“ کاٹنے والے ”کوآرنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemingway) (۱۸۹۹ء-۱۹۶۱ء) کے مشہور افسانہ ”قاتل“ (The killers) سے اخذ و قبول کے کرشمے قرار دیا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر علمدار حسین بخاری کا کہنا ہے کہ:

“مرکزی خیال اور فنی تکنیک کے برتنے میں ہمگلوے کا یہ افسانہ
 “قاتل” (The Killers) اور غلام عباس کا “ناک کاٹنے والے” ایک
 جیسے ہیں، لیکن نقشِ اول کی بہر حال اپنی اہمیت ہے اور غلام عباس نے اس کا
 جو چہرہ اُتارا ہے وہ بہر حال چہرہ ہی ہے۔۔۔ غلام عباس کے ان دونوں افسانوں
 کی پریم چند اور ہمگلوے کے متون (Texts) سے مشابہت و مماثلت اس
 کے فنی مرتبے کو کم نہیں کرتی بلکہ “آئندی” کی پریم چند کے ناول
 کے مخصوص حصے سے مشابہت غلام عباس کی تخلیقی قوت کو منکشف کرتی
 ہے۔ جزئیات کے حسن کے باوجود پریم چند کی اصلاح پسندی نے فنی چمک کو ماند
 کر دیا ہے، جب کہ غلام عباس کی معروضیت اور سبک فنی تعمیر نے ان کے
 افسانے کو ایک شاہکار بنا دیا ہے۔ “ناک کاٹنے والے” ایک دلچسپ افسانہ
 ضرور ہے، لیکن ہمگلوے کے Killers کے سامنے یہ ایک معمولی کہانی
 دکھائی دیتی ہے اور ہمگلوے کے افسانے سے اس کی مماثلت کا کوئی دفاع بھی
 پیش نہیں کیا جاسکتا۔” (۱۰)

یہ درست ہے کہ بادی النظر میں مذکورہ دونوں کہانیوں کی پریم چند اور انسٹ ہمگلوے کے
 افسانوں سے کسی حد تک مماثلت نظر آتی ہے، تاہم اس مشابہت کی اتفاق سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں۔ اس
 امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ غلام عباس اردو ادبیات کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں، جو انسانی زندگی
 میں پائی جانے والی منافقت اور ظاہر و باطن میں موجود تضادات کے ساتھ کچھ ایسے مہر آمیز انداز میں چھیڑ
 چھاڑ کرتے ہیں کہ قاری کو ان کے کرداروں سے گھٹن آنے کے بجائے محبت کی حرارت محسوس ہونے لگتی
 ہے۔ تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت، انسان اور کائنات کے باہمی تعلقات کا مطالعہ اور سماجی مسائل کی
 فرسودگیاں ان کے افسانوں میں جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی
 کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی “کھوجی” یا “سراغ رساں” کی مانند ہمارے گھروں کے اندر
 جھانک جھانک کر ہماری داخلی زندگی کی جاسوسی کرتے رہتے ہیں اور بعد ازاں اسی کھوج کی بنیاد پر اپنی کہانیوں
 کا ڈھانچہ تیار کر کے اُنھیں یادگار افسانہ بنا دیتے ہیں۔

مزید یہ کہ وہ انسانی خواہشات اور ترجیحات کے درپردہ نفسیاتی عوامل پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ
 ساتھ، انسان کے نہایت ادنیٰ اور خفیف نوعیت کے معاملات کو گہری توجہ اور انہماک سے مشاہدہ کرنے کے
 عادی ہیں، گویا انسان کی فطری کمزوریوں اور داخلی ہیجان و اضطراب کی پردہ دری خلوص کے پردے میں بیان
 کرنا ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ زیادہ تر چھوٹے طبقے کے عام افراد کی

داخلی کائنات کا مطالعہ کر کے اپنی کہانیوں کے لیے تار و پود مہیا کرتے ہیں۔ غلام عباس خود کو بھی ایک عام آدمی ہی خیال کیا کرتے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے افسانوں کی ہنت (Craftsmanship) بھی عام انسانوں کے گرد ہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں عام آدمی کی ذہنی و جذباتی کیفیات کے پاتال میں اترنے کا سلیقہ اور بعد از مشاہدہ، قدرتِ اظہار کا وظیفہ خوب آتا تھا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور ان کی معروضی صداقتوں کو اپنے جیٹے فن میں لانے کے لیے کرداروں کے باطن میں اترنے اور ان کی سیرت کے چھپے ہوئے گوشوں کو دریافت کرنے کی کاوش کرتے ہیں اور اکثر اوقات بدی کی کوکھ سے انسان کی ازلی وابدی نیکی کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ (۱۱)

ان کے افسانوں کو پڑھ کر معاشرتی مسائل پر غور و فکر کرنے کی احتیاج یک بارگی دامن گیر ہو جاتی ہے، جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی تہذیب کریں تاکہ مسائل کی خود رو جھاڑیاں ہماری سماجی زندگی کو تار تار نہ کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی کہانیاں زندگی کے بطن سے نمودار ہوتی ہیں، جن میں حقیقت سے انماض یا اجنبیت کی روش سراسر مفقود دکھائی دیتی ہے۔ غلام عباس بنیادی طور پر ایک حقیقت نگار ہیں، اس لیے زندگی بھر انھوں نے حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ معاشرے میں انھوں نے جو برائیاں اور اچھائیاں دیکھیں، انھیں ہو بہو افسانے کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ (۱۲) ن۔ م۔ راشد (۱۹۱۰ء۔ ۱۹۷۵ء) کے خیال میں:

“غلام عباس ایک پُر امن اور پُر آہنگ گھریلو زندگی کے فن کار ہیں۔ ان کے فن میں زندگی کے رنگارنگ مسائل کا احساس ملتا ہے اور زندگی سے اتنی گہری محبت ہے کہ وہ نہ تو زندگی کے نیچے اُدھیرتا ہے، نہ اُسے نگا کرتا ہے اور نہ اپنی انا سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، بل کہ زندگی کو محرم راز جانتا ہے اور وہ جیسی کچھ ہے، اُسی طرح قاری کے سامنے لے آتا ہے۔” (۱۳)

سیاسی نظریات یا پراپیگنڈہ کے زیر تسلط ادب کی تخلیق ان کے نزدیک سخت ناپسندیدہ عمل تھا۔ بعینہ مادی وسائل کے حصول کے لیے تخلیق کیا جانے والا ادب بھی ان کے ہاں بار نہیں پاتا۔ غلام عباس کا اپنا بیان ہے کہ وہ کسی جماعت یا پارٹی کے نظریات کے زیر اثر ادب تخلیق نہیں کرتے، بل کہ وہ اپنے لیے لکھتے ہیں اور انھوں نے خود کو کبھی کسی سیاسی گروہ سے منسلک نہیں کیا۔ (۱۴) مزید یہ کہ ادب میں کوئی مجبوری یا زبردستی کا ٹھونسنا ہوا مواد نہیں ہونا چاہیے۔ (۱۵) اس لیے وہ کسی کی فرمائش یا ہدایت کے مطابق ادب تخلیق نہیں کرتے۔ یوں بھی ادیب سے کسی خاص قسم کا ادب تخلیق کرنے کی فرمائش کرنا سخت قابل اعتراض ہے۔ مختصر یہ کہ پیسے کے حصول یا کسی پراپیگنڈہ کی غرض سے لکھنا خالص ادب نہیں ہوتا۔ (۱۶) بلاشبہ غلام عباس “ادب برائے ادب” کے قائل ایسے افسانہ نویس تھے، جو تا عمر کسی ادبی تحریک سے عملی طور پر کبھی

وابستہ نہیں رہے، تاہم کسی حد تک وہ ترقی پسند تحریک سے درپردہ متاثر ضرور تھے، جس کی خفیف سی لہر اُن کے افسانوں، ”آندنی“، ”چکر“ اور ”کتبہ“ میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ غلام عباس اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

”میری چیزیں ترقی پسندانہ رہیں، لیکن میں نے لیبل لگانا پسند نہیں کیا۔ اس تحریک سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ ادب کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا غلط ہے۔ کسی سیاسی نقطہ نظر کو ادب یا ڈرامے کے ذریعے پھیلا یا جائے تو میں اسے ادب نہیں سمجھتا۔“ (۱۷)

غلام عباس نے اپنے افسانوں میں طنز کی باریک اور لطیف دھار سے بھی کام لیا ہے۔ (۱۸) اس ضمن میں اُن کے افسانوں، ”آندنی“ اور ”بابے والا“ میں طنز کی کاٹ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، تاہم آئرنی (Irony) کو اُنہوں نے اپنے افسانوں میں بہ طور حربہ کمال خوبی سے برتا ہے۔ اس حوالے سے ”بردہ فروش“، ”بندر والا“، ”بھنور“، ”اور کوٹ“، ”یہ پری چہرہ لوگ“، ”جوار بھانا“ اور ”ریگنے والے“ آئرنی کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح غلام عباس نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی وسیلوں سے بھی بہت مہارت کے ساتھ کام لیا ہے۔ مثلاً، ”پتلی ہائی“ میں ایک نوجوان کا نفسیاتی مطالعہ یا افسانہ ”روحی“ میں ایک بوڑھے شخص کی نفسیات عروج پر دکھائی گئی ہے۔ غلام عباس کے افسانوں میں جنسی رجحان تو پایا جاتا ہے، تاہم اُنہوں نے اس حوالے سے اشاروں، کنایوں اور ڈھکے چھپے انداز کو زیادہ فوقیت دی ہے، یعنی دیگر افسانہ نویسوں کے برعکس اُن کے ہاں جنسی لذتیت سے گریز شعوری سختی کا پابند نظر آتا ہے۔

غلام عباس کے افسانے دراصل ہمارے سماج کی گذشتہ نصف صدی کے ذہنی، جذباتی، معاشرتی، تہذیبی اور انگریزی رجحانات کے حقیقی آئینہ دار ہیں۔ اس معاشرے کے صحیح خدو خال کو تاریخ اور تہذیب و معاشرت سے متعلق علمی کتابیں بھی اس طرح پیش نہیں کرتیں، جس طرح سے غلام عباس کے افسانے پیش کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ معاشرے کی اس تریبہائی میں افراد کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ اُن کے ہاں ایک آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ (۱۹) غلام عباس اپنے افسانوں میں سماجی اصلاح کے ضمن میں مخالفانہ یا موافقانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے نتیجہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ وہ خود نتیجہ اخذ کرے۔ اس تکنیک کی بدولت اُن کی کہانیوں میں نئی نئی جہتیں اور پہلو جنم لیتے ہیں، جو اُن کے افسانوں کی تازگی میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

جہاں تک غلام عباس کی کردار نگاری کا تعلق ہے تو اُن کے ہاں خیالی یا مثالی کرداروں کے بجائے متحرک اور جان دار کردار پائے جاتے ہیں، جو ہماری گرد و پیش کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جو دن رات ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں، جو ہم آپ میں سانس لیتے ہیں اور جن سے ہمارا تعارف بہت قریب کا

ہے۔ اُن کے کردار نہ تو بہت زیادہ امیر طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ ہی بہت زیادہ غریب طبقہ کی، بل کہ ایسے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں، جو کم از کم رات کو پیٹ بھر کر سوتا ہے۔ بہ قول سویامانے یاسر:

”غلام عباس کے افسانوں کے کرداروں میں انتہائی امیر لوگ یا انتہائی غریب لوگ نظر نہیں آتے، بل کہ ایسے کردار عموماً نظر آتے ہیں، جن کا کاروبار یا جن کی حیثیت کیسی ہو، بہر حال ان کو روزی تو ملتی رہتی ہے۔ یعنی غلام عباس کے ہاں کردار غربت میں دھنسے ہوئے نہیں، بلکہ زندگی کی دوسری مجبوریوں کے سبب معاشرے میں پیدا ہونے والی کش مکش یا منافقت میں پھنسے ہوئے ہیں۔“ (۲۰)

در اصل عام انسانی مجبوریاں ہی اُن کے افسانوں کا بنیادی موضوع بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس اپنے کرداروں کو اپنے ارد گرد کی زندگی سے کشید کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کے کرداروں میں تنوع کی صفت در آئی ہے۔ اُن کے ہاں فطری انداز کے حامل ایسے کردار ہیں، جو زندگی کے آلام سے سمجھوتہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ سمجھوتہ کرنا انسانی زندگی کا ایک ناگزیر عمل ہے، بل کہ بعض اوقات تو یہ امر مجبوری یا حاجت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غلام عباس کے کردار اسی بنا پر ہمیں اچھے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں اُن کے لیے ہمدردی کے جذبات جنم لیتے ہیں کہ ہمیں اُن کرداروں میں اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں اجتماعی زندگی کے دکھ سکھ، محرومیاں اور تلخیاں انگاروں کی طرح سلگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ (۲۱) مثال کے طور پر افسانہ ”سایہ“ میں غلام عباس نے انسانی فطرت اور نفسیات کی ایسی عمدہ منظر کشی کی ہے کہ قاری حیران رہ جاتا ہے، بل کہ کہیں کہیں تو اس افسانے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے ہی کسی محلے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ غلام عباس کا کمال یہ ہے کہ اس افسانے میں شمشاد کی بہن اور ریاض کے درمیان کوئی واسطہ یا تعلق ثابت نہیں ہوتا، مگر پھر بھی سبحان کی باخبری اور تشویش سبحان کے کردار کو ہماری نظروں میں قابل توجہ بنا دیتی ہے۔ پورے ماحول میں وہ سب سے زیادہ باخبر ہے، وہ سائے کی ہر حرکت سے نئے نئے معنی و مطالب اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور گفتگو کی طوالت کی وجوہات خوب جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ سبحان کے کردار اور بے لوث احساسات کو غلام عباس نے کمال ہنرمندی، خلوص اور چابک دستی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔

غلام عباس کے افسانوی کرداروں میں ثنویت یا دوہریت (Duality) کی تکنیک قاری کے ذہن میں ایک عجیب سا احساس بیدار کرتی ہے، جس کی بہ دولت قاری ایک دھڑدو چہرے والی مخلوق کی ظاہری و باطنی تفہیم کے قابل ہو جاتا ہے۔ دوہرے پن کا وصف لیے ہوئے یہ کردار ہمہ وقت ظاہر و باطن کے تضاد اور کش مکش کی کیفیات سے دست و گریباں رہتے ہیں۔ ثنویت کے حامل یہ کردار ایک دوسرے

کے متوازی سفر کرنے کے باوجود افسانے کی تفہیم میں سدراہ نہیں بنتے، بل کہ کہانی کی ضرورت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً، ”بردہ فروش“ کے دو بڑھے کرم دین اور چودھری گلاب، ”اور کوٹ“ کا سببیلانوجوان، ”اس کی بیوی“ میں نجی اور نسرین، ”سایہ“ کے دو بھائی شمشاد اور مختار اور اُن کی دو بہنیں بہار اور گل وغیرہ۔ بعض مواقع پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی کہانیوں کے ہیرو و مضامی کرداروں کے مقابلے میں پیٹے ہیں (جو کسی حد تک درست بھی ہے۔)

غلام عباس کے وہ نسوانی کردار جو حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر معاشرے کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ غلام عباس موری کی اینٹ بننے والے اُن کرداروں کے لیے بھی انسانی سماج میں دوبارہ جذب ہو جانے کے فطری مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ”بھنور“ کی بہار اور ”بردہ فروش“ کی ریشماں کے کردار، بہ طورِ نظیر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ غلام عباس کے ہاں نسوانی کردار مرد کرداروں کی بہ نسبت قدرے کم ہیں اور اُن میں سے بھی زیادہ تر معاشرے کے نچلے یا ڈھنکارے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان نسوانی کرداروں میں حالات سے سمجھوتہ یا مصالحت کرنے کی صفات فطری انداز میں پائی جاتی ہیں، جب کہ اُن کے مرد کردار، نفسانی خواہشات کے اسیر ہونے کے بجائے عورت کی عصمت کی حفاظت کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اُن کے مرد کردار عورت کے نگہبان اور خیر اندیش بننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یعنی اُن کے نسوانی کردار بھی مرد سے دُوری پسند نہیں کرتے۔ بہ قول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:

”غلام عباس کے کردار ایک دوسرے سے دُکھ کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ کو محسوس کرنے اور اسے بائٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ (۲۲)

غلام عباس قوتِ اظہار پر قدرت رکھنے والے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں، جنہیں بات کہنے کا عمدہ سلیقہ اور وصف خالق کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ اسی لیے مطالب کے اظہار پر قدرت غلام عباس کی قوتِ بیان کا بہترین مظہر ہے۔ (۲۳) اُن کے خلق کیے ہوئے افسانوں کی زبان سادہ، مگر پختہ انداز کی حامل ہے، جو دبستانِ دہلی کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی زبان و بیان کو سنوارنے کے لیے شعوری کوششیں کی ہیں۔ (۲۴) اُن کا لب و لہجہ دھیمہ، ملائم اور عدم اشتعال کے اوصاف سے مزین ہے۔ اسی طرح اُن کے ہاں زبان کے استعمال کا تصور بھی بہت نکھر اہوا ہے۔ اُنھوں نے اپنی زبان کی آرائش کے لیے تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیا ہے۔ وہ مترادفات اور محاورات کے استعمال اور غیر ضروری طوالتِ بیا کو سخت ناپسند اور کفایتِ لفظی (Economy of Words) پر یقین رکھتے تھے۔ (۲۵) ڈاکٹر مشرف احمد اس ضمن میں غلام عباس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسلوب کی سادگی و پُرکاری، مترادفات سے گریز، کفایتِ لفظی اور بھرپور

کہانی اُن کی نمایاں خوبیاں ہیں۔“ (۲۶)

غلام عباس کے افسانوں کے سرسری مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کے افسانے طویل سوچ، بچار اور تفکر کا نتیجہ ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کو مہینوں اور بعض اوقات برسوں اپنے ذہن میں تیار کرتے رہتے اور جب اُنھیں یقین ہو جاتا کہ اُن کی کہانی اب لکھنے کے لیے تیار ہو گئی ہے، تب وہ اُسے احاطہ تحریر میں لاتے تھے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے افسانے ہنگامی نوعیت کی کیفیات سے اچانک منصرہ مشود پر نہیں آئے، بل کہ وہ اپنی کہانیوں کو گہرے غور و فکر اور عمیق سوچ کے الاؤ میں ضروری حد تک پکا کر سپردِ قلم کرنے کے عادی تھے۔ گویا وہ رسمی انداز میں لکھنے کے بجائے ایسے لکھتے تھے، جیسے آخری بار لکھ رہے ہوں۔ یوں اُنھیں، ”مسٹر پرفیکٹ (Mr. Perfect)“ بھی کہا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ تقریباً نصف صدی کو محیط غلام عباس کا ادبی سفر بسیار نویسی کا شکار نہیں ہوا۔ اُنھوں نے جتنا بھی لکھا وہ قلم سنبھال کر، حشو و زوائد سے بچتے ہوئے، سراپا انتخاب ”لکھا۔ بقامت بہتر، بقیمت بہتر“ کے مصداق غلام عباس مقدر کے بجائے معیار کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں تھوڑے پر ہی قانع رہنے کی روش ملتی ہے، اُنھوں نے اپنے دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں کی بہ نسبت قدرے کم کم لکھا ہے، مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ بہ اعتبار مرتبہ بدرجہا برتر اور عمدہ لکھا ہے۔ اتنے طویل عرصہ میں اُن کے طبع زاد تین افسانوی مجموعوں میں کل افسانوں کی تعداد ۳۳ بنتی ہے، جو اُن کی چالیس سالہ تخلیقی زندگی کے لحاظ سے کوئی ایسی زیادہ نہیں، بل کہ تخلیقی زندگی اور تخلیقات کو تقسیم کرنے پر حاصل سال میں بہ مشکل ایک افسانہ بنتا ہے، مگر اس کے باوجود اُردو افسانہ کی کسی نقطہ نظر سے کوئی تاریخ کیوں نہ مرتب ہو، وہ غلام عباس کے افسانہ کے بغیر نامکمل رہے گی۔ (۲۷) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۶ء-۲۰۱۳ء) لکھتے ہیں:

”اگرچہ تعداد اور مقدر میں اُن کے افسانے اُن کے ہم عصروں کے مقابلے

میں بہت کم ہیں، لیکن معیار و مقبولیت کے لحاظ سے اُن کا نام اور اُن کا مقام

بہتوں سے بلند ہے۔“ (۲۸)

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ بر ملا کہا جاسکتا ہے کہ غلام عباس بین الاقوامی معیار کے حامل افسانہ نویس ہیں، جس کا ثبوت اُن کے طبع زاد وہ افسانے ہیں، جن کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اپنے ہم عصروں یعنی کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے درمیان غلام عباس اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور اُنھوں نے قدرِ اول سے کم تر درجے کی کوئی چیز نہیں لکھی۔ (۲۹) قصہ مختصر، بات اسلوب بیان کی ہو یا تکنیک کی، بحث پلاٹ کی ہو یا حقیقت نگاری کی وہ ہر حوالے سے بے مثال اور بے

بدل افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی قدر و قیمت اور تازگی مزید بڑھائیں گے اور یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ غلام عباس کے فن کی عمر بہت لمبی ہے۔



حواشی و حوالہ جات:

- ۱۔ حکیم یوسف حسین کے رسالے، ”مازیانہ“ میں غلام عباس مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔
- ۲۔ غلام عباس اور سیزر سروسز بی بی سی لندن میں ۱۶ جولائی ۱۹۴۹ء سے ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء تک بہ طور، ”اسسٹنٹ“ خدمات سرانجام دیتے رہے۔
- ۳۔ ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ جب غلام عباس دیال سنگھ ہائی سکول لاہور میں زیرِ تعلیم تھے تو اُس زمانے میں اُنھوں نے، ”بکری“ نامی کہانی لکھی، جو زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔
- ۴۔ دیال سنگھ ہائی سکول لاہور کے مذکورہ اُستاد کا نام مولوی طالب علی پابند تھا۔
- ۵۔ شہزاد منظر، غلام عباس۔ ایک مطالعہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۱
- ۶۔ غلام عباس ان دونوں ہفتہ وار جریدوں سے بہ طور، ”اسسٹنٹ ایڈیٹر“ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۷ء تک منسلک رہے۔ ”پھول“ ”بچوں کے لیے جب کہ“ ”تہذیب نسواں“ ”عورتوں کا جریدہ“ تھا۔
- ۷۔ غلام عباس آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے اس رسالے میں ۲ فروری ۱۹۳۸ء سے ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء تک بہ طور، ”سب ایڈیٹر“، جب کہ بعد ازاں یکم مارچ ۱۹۳۵ء سے ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء تک، ”اسسٹنٹ ایڈیٹر“ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔
- ۸۔ غلام عباس ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء سے ۶ دسمبر ۱۹۳۸ء تک ریڈیو پاکستان کراچی کے اس رسالے میں بہ طور ”ایڈیٹر“ منسلک رہے۔
- ۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲
- ۱۰۔ علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، غلام عباس کے افسانوں میں اخذ و قبول۔ چند شواہد، قومی زبان، کراچی، جلد: ۳، شمارہ: ۲۰۰۱ء، ص ۶۲
- ۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانہ عہد بہ عہد، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۲
- ۱۲۔ شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۹
- ۱۳۔ ن۔ م۔ راشد، جاڑے کی چاندنی، کراچی: مکتبہ سجاد کامران، ۱۹۶۰ء، ص ۹

- ۱۴۔ انٹرویو، انجم رشید، اُردو کے معروف افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات، روزنامہ حریت کراچی، ۱۹ جون ۱۹۸۱ء
- ۱۵۔ انٹرویو، بشیر نیاز، غلام عباس سے ایک ملاقات، ہفت روزہ نصرت لاہور، ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء
- ۱۶۔ انٹرویو، تبسم عارف، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۷ اپریل ۱۹۸۱ء
- ۱۷۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء، ص ۴۳
- ۱۸۔ اسلوب احمد انصاری، اندازے، علی گڑھ: یونیورسٹی بک ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۵
- ۱۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، “غلام عباس کی افسانہ نگاری” مضمولہ “غلام عباس: فکر و فن” مرتب: ایم خالد فیاض، راولپنڈی: نقش گریپلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۴۴
- ۲۰۔ سویامانے یاسر، غلام عباس۔ سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۴
- ۲۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ: تحقیق و تنقید، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۲۵۹
- ۲۲۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷۲
- ۲۳۔ ندیم احمد، تعصبات اور تنقید، کوکٹا: رہروان ادب، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۳
- ۲۴۔ حسن عسکری، محمد، مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۸
- ۲۵۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر، غلام عباس، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶
- ۲۶۔ مشرف احمد، ڈاکٹر، غلام عباس کے دفاع میں، کراچی، قومی زبان، جلد: ۳، شمارہ: ۹، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹
- ۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۸
- ۲۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور، الو قار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۹
- ۲۹۔ عبدالمنعمی، تنقیدی زاویے، علی گڑھ: آصف پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۸